عرش کا خزانہ

خُرّم مُرادؔ

منشورات

00130 / 13

جملہ حقوق محفوظ

عرش کا خزانہ از خرم مرادؒ

جنوری ۲۰۰۹ء _ تعداد: ۲۰۰۰ _ کوڈ: 00130 _ قیمت: ۱۳ روپے

ناشر: **منشورات**، منصورہ، لاہور۔ ۵۴۷۹۰ _ مطبع: جے کیو پریس، بند روڈ، لاہور۔

فون: 35252211 _ فیکس: 042-35252210 _ ای میل: manshurat@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کو دو بڑی ذمہ داریاں سپرد کی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، اس نے جو دین دیا ہے اس کی پابند رہے، اور جو شریعت عطا کی ہے اس کے اوپر چلے۔ دوسری بڑی ذمہ داری اس نے یہ سپرد کی ہے کہ وہ اس دین اور شریعت پر سارے انسانوں کے سامنے گواہ بن کر کھڑی ہو۔ اپنے قول وعمل سے ان کے سامنے اس دین اور شریعت کو پیش کرے۔

یہ دو ذمہ داریاں اور دو امانتیں جو اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کے سپرد کی ہیں، ان سے ہمارا بڑا گہرا تعلّق ہے۔ ان ذمہ داریوں کا بڑا جامع اور بہت اہم بیان اور تذکرہ سورۂ بقرہ میں کیا گیا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے منصب اور ذمہ داری کا اعلان فرمایا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۲:۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک ''اُمت وسط'' بنایا ہے، تا کہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

دوسرے اس میں شریعت کے تقریباً تمام ہی بنیادی اجزا، اصولوں اور تعلیمات کو بیان

فرمایا ہے۔ توحید، رسالت، آخرت، عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، انفاق فی سبیل اللہ، حج، ان سب کے بارے میں بیان موجود ہے۔ وہ اُمت مسلمہ جس کو خود بھی اللہ کے احکام پر عمل کرنا ہے اور دوسروں کے سامنے بھی گواہی دینا ہے، اس کی اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کے لیے نکاح، طلاق، خاندانی زندگی کے بارے میں احکام بھی اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کام کو کرنے کے لیے جس جہاد اور قتال کی ضرورت ہے اور جو مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے، اس کے احکام بھی اس سورہ میں موجود ہیں۔

البقرۃ قرآن مجید کی صرف اسی لیے ممتاز سورہ نہیں ہے کہ یہ ایک طویل ترین سورہ ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ بڑے اہم مضامین اور بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر اس سورہ کو ''سنام القرآن'' بھی کہا گیا ہے۔ جس طرح اونٹ کا کوہان نمایاں ہوتا ہے اسی طرح یہ پورے قرآن میں نمایاں اور ممتاز سورۃ ہے۔ اِس سورہ میں اُمت کی ذمہ داریاں بیان کرنے کے بعد، اور اس سے پچھلی اُمت بنی اسرائیل جس پر یہی دونوں ذمہ داریاں ڈالی گئی تھیں، اس میں جو بگاڑ اور خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اس کی تفصیل بیان کر کے اور اس کا آئینہ سامنے رکھ کے، اللہ تعالیٰ نے آخر میں دو جامع آیات میں ہماری ہدایت کا سامان کیا ہے۔

عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ

سورۂ بقرہ کی یہ وہ آخری دو آیات ہیں جن کے بارے میں بہت سی احادیث میں ان کی اہمیّت اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ان آیات کو یاد کرنا، ان کو بار بار پڑھنا، ان کی تعلیم عورتوں اور بچوں کو دینا، ان سب کی ہدایات نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو دی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عرش کے نیچے اللہ تعالیٰ کے جو خزانے ہیں، ان خزانوں میں سے یہ دو آیات مجھے عطا کی گئی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین یہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی

عقل مند آدمی یہ دو آیات پڑھے بغیر نہیں سو سکتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سی احادیث ہیں جن سے ان آیات کی اہمیّت اور فضیلت واضح ہوتی ہے۔

میں اِن آخری دو آیات اور ان سے پہلے ایک اور آیت جو کہ متصل ہے اور ان دو آیات کی بنیاد ہے اور ایک طرح سے پوری سورۂ بقرہ اور ان دو آیات کے درمیان پل اور رابطے کا کام کرتی ہے، پر روشنی ڈالوں گا۔

سورۃ البقرۃ جن تعلیمات پر مشتمل ہے، اور جن تعلیمات کے ذریعے سورۃ البقرہ میں دیے ہوئے احکام الٰہی کی اطاعت کرنے کی طاقت اور قوت واستعداد پیدا ہو سکتی ہے، اس کا بیان اس آیت میں ہے جو آخری دو آیات سے پہلے ہے۔ ان دو آیات میں دراصل وہ نسخہ دیا گیا ہے جس کے ذریعے جو بڑی بھاری ذمہ داری اور بوجھ اس اُمت پر ڈالا گیا ہے، یعنی اللہ کی اطاعت اور پوری دُنیا کے سامنے دین اور حق پر گواہ بننے کا فریضہ، اس کے لیے جو اسلحہ اور ساز و سامان ضروری ہے وہ ان آخری دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِيۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنۡ يَشَاءَ ؕ واللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝ (البقرہ ۲ : ۲۸۴)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو خواہ چھپاؤ، اللہ بہر حال ان کا حساب تم سے لے لے گا۔ پھر اُسے اختیار ہے، جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس کے اندر پہلی بات جو دین کی بنیاد ہے وہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ عربی زبان میں اس کے لیے ''ل'' کا حرف استعمال

ہوا ہے۔ ''لِ'' کا ترجمہ میں نے 'اس کے لیے' کیا ہے۔ اردو زبان میں صحیح معنوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو ''لِ'' کے معنی کو ایک ہی لفظ کے اندر ظاہر کرتا ہو۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ آسمانوں اور زمین اور اس میں جو کچھ ہے' یعنی انسان، ہمارا وجود' دُنیا کے اندر پھیلی ہوئی ہر چیز اور اس پوری کائنات میں جو کچھ ہے اللہ کی ملکیت ہے۔ کوئی چیز بھی کسی دوسرے کی ملکیت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے جب انسان اللہ پر ایمان لاتا ہے تو وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کی زندگی' جان و مال، وقت اور صلاحیتیں، ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے۔ جیسا کہ سید مودودیؒ نے فرمایا: ایمان لانے کے بعد ایک مسلمان کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ کہے کہ یہ ہاتھ میرا ہاتھ ہے' یہ پاؤں میرے پاؤں ہیں، یہ دماغ میرا دماغ ہے اور یہ مکان میرا مکان ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اس کے پاس ہر چیز اللہ کی طرف سے بطور ایک امانت ہے جو خلافت کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے اس کے سپرد کی گئی ہیں۔

بندے اور رب کا تعلّق

یہ اتنی جامع آیت ہے کہ توحید کے موضوع پر، بندے اور رب کے تعلّق پر اور دُنیا میں ملکیت و حکومت اور اقتدار کے سارے دعویداروں کی تردید کے لیے بالکل کافی ہے۔ گویا زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کی ملکیت میں نہ ہو۔ ہر چیز اس کی مِلک ہے۔ یہ دراصل توحید کی بنیاد ہے۔ محض اللہ کو مان لینا کہ وہ ہے یہ کافی نہیں ہے بلکہ یہ ماننا کہ صرف اسی کی ملکیت ہے اور کسی کی نہیں' یہ دراصل توحید کی روح ہے۔ توحید کا سبق اور عملی زندگی میں اس کے نفاذ کا عمل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔

اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جب یہ پوری کائنات اللہ کی ملکیت ہے تو اس میں حکم بھی صرف اسی کا چلے گا۔ کسی اور کا حکم نہیں چل سکتا۔ تدبیر اور امر، تمام معاملات کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔

وہ ایسا مالک نہیں ہے کہ وہ اپنی ملکیت سے بہت دور بیٹھا ہو اور اس پر کوئی بھی قبضہ کر لے، بلکہ وہ خود عرش کے اوپر قائم ہے۔ تختِ سلطنت پر وہی جلوہ افروز ہے اور زمین و آسمانوں میں سارے کاموں کی تدبیر وہی کرتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ ۳۲: ۵)

وہ آسمان سے زمین تک دُنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔

گویا آسمان سے زمین تک حکم کی تدبیر، اس کی منصوبہ بندی اور اس کا نفاذ، سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کا ایک پہلو اس طرح بھی واضح کیا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں حکومت صرف اسی کی ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید ۵۷: ۵)

وہی زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔

اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ اپنی ملکیت میں قانون سازی اور قانون بنانے کا اختیار بھی اسی کو ہے۔ انسان اپنے جسم کو کیسے استعمال کریں، اپنے مال کو کیسے استعمال کریں، دوسرے انسانوں سے تعلقات کیسے قائم کریں، معاشرہ کیسا ہو، قانون کس کا ہو، اقتدار کس کا ہو —— ان تمام سوالوں کا جواب یہی دیا گیا ہے کہ یہ حق اور اختیار بھی اسی کا ہے کہ وہی قانون بنائے اور ضابطۂ حیات کا تعیّن کرے۔ اسی لیے جو شخص اپنے جسم پر، اپنی زندگی پر اس کی ملکیت تسلیم کرتا ہو، اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح یہ روش اختیار کرے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ ۲: ۱۳۱)

جب اس کے رب نے اس سے کہا: مسلم ہو جاؤ، تو اس نے فوراً کہا: میں مالکِ کائنات کا مسلم ہو گیا۔

گویا اللہ تعالیٰ جو بھی حکم دے گا میں اس کی اطاعت کے لیے حاضر ہوں۔ لہٰذا ملکیت اور قانون سازی کا حق بھی اسی کے لیے ہے۔

اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ چونکہ ملکیت اسی کی ہے، اس لیے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ہر چیز کا مرجع وہی ہے۔ خیر اور شر سب اس کی طرف سے ہے، لہٰذا اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اگر کوئی بھلائی پہنچ سکتی ہے تو اللہ کی طرف سے اور اگر کوئی شر ہے تو وہ بھی اسی کی طرف سے ہے۔ اگر نفع ہو سکتا ہے تو اسی سے اور اگر نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ بھی اسی سے۔ لہٰذا انسان کی التجا، حاجت روائی، درخواست اور اس کے بھروسے کا مرجع و ماویٰ اللہ تعالیٰ ہی کو ہونا چاہیے۔

اس چھوٹی سے آیت کے اندر توحید اور بندے اور رب کے درمیان تعلّق کے بارے میں یہ ساری باتیں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ یہ دین کا بنیادی اور اتنا اہم اصول ہے کہ پورے قرآن مجید میں شروع سے لے کر آخر تک اسی کی بار بار تکرار ہوئی ہے اور مختلف انداز میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

احتساب اور جواب دہی

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے:

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِهِ اللّٰهُ (البقرہ ۲: ۲۸۴)

تم ظاہر کرو یا چھپاؤ جو کچھ بھی تمھارے دلوں میں ہے اللہ تعالیٰ اس کا ضرور حساب لے گا۔

توحید کے راستے پر قائم رہنے کے لیے اور سورۂ بقرہ میں ہر مسلمان اور پوری اُمت مسلمہ کے سپرد کیے جانے والے شہادت حق اور عدل و انصاف کی بالادستی کے فریضے کی ادایگی کے لیے جہاں اللہ تعالیٰ کی توحید پر یقین اور ایمان ضروری ہے وہاں محاسبہ، احتساب اور جواب دہی بھی ضروری ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے نائب ہونے کی حیثیت سے

بندگی، شہادت حق اور انصاف کی سر بلندی کے لیے خدا نے جو میری ذمہ داری لگائی ہے، اس کے لیے میں جواب دہ ہوں اور خدا اس کے بارے میں مجھ سے حساب لے گا۔ یہ حساب اس قدر کڑا ہوگا کہ جو چیزیں انسان کی ظاہری ملکیت ہیں اور ظاہر میں جو عمل وہ کرتا ہے وہ فرشتے بھی لکھ رہے ہیں اور اعمال نامے کے اندر بھی درج ہو رہے ہیں، اس کا حساب تو ہوگا ہی بلکہ یہاں اس حساب کی نزاکت و باریکی کو یہ کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ چیزیں جو دل میں ہیں ان کا بھی وہ حساب لے گا۔ اس طرح آدمی ہر وقت خوف اور اندیشے سے لرزتا رہتا ہے، ہر وقت بے چین اور مضطرب رہتا ہے گویا وہ دل میں بھی کوئی ایسا ارادہ نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ کے حقِ ملکیت کے خلاف ہو یعنی اُس مُنعمِ حقیقی کی عطا کردہ کسی چیز یا نعمت کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ بھی دل میں نہیں گزرنے پاتا۔

یہاں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا جوابدہی کا مطالبہ صرف ان چیزوں کے بارے میں ہے جو ہمارے اختیار میں ہیں۔ اسی بات کو اسی سورہ میں اگلی دو آیات میں واضح کر دیا گیا ہے۔ البتہ یہ بات واضح رہے کہ ایک تو وہ خیالات ہیں جو آدمی کے دل میں بغیر ارادے کے اٹھتے یا پیدا ہوتے ہیں، شیطان وسوسے ڈالتا ہے کہ یہ برا کام کر لیا جائے یا کوئی برا ارادہ دل میں آئے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ وسوسوں اور شکوک و شبہات کا پیدا ہونا آدمی کے اختیار میں نہیں ہے۔ دل تو ایک سڑک کی طرح ہے کہ جس پر ہر قسم کی ٹریفک چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح دل میں ہر قسم کے خیالات، ہر قسم کی تمنائیں اور ہر نوع کی خواہشات سر اٹھاتی رہتی ہیں۔ لہٰذا دل پر آدمی کا قابو نہیں ہے۔ یہاں مراد دراصل وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں آدمی اپنے دل میں سوچ سمجھ کر ارادہ کرے کہ انھیں کرے گا۔ اگر کوئی اچھا ارادہ کرے اور نہ کر پائے تو اس ارادے پر بھی اجر ہے، لیکن وسوسے یا خیال آنے پر کوئی گرفت بہر حال نہیں ہے۔

دوسری بات جو یہاں بیان کی گئی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ دلوں میں پائے جانے والے ارادوں

کا بھی حساب لے گا۔ اس لیے جو اعمال ظاہر ہیں کہ جن کو سب جانتے اور دیکھ رہے ہیں، اور فرشتے بھی اعمال نامے میں درج کر رہے ہیں ان کا تو حساب ہوگا ہی مگر جو کچھ انسان کے دل کے اندر ہے روزِ محشر اس کا بھی حساب ہوگا۔ حالانکہ دل کی چیزیں فرشتے نوٹ نہیں کرتے۔ یہ احادیث سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی اس کا بیان فرمایا ہے کہ میں تمھاری وہ باتیں بھی ظاہر کروں گا کہ جو فرشتوں نے بھی درج نہیں کی ہوں گی۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (الطارق ۸۶: ۹)

جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی۔

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (العٰدیٰت ۱۰۰:۱۰)

جو دلوں میں ہے وہ بھی نکال کر باہر رکھ دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ تو علیم بالذات الصدور ہے، وہ دلوں کے حال تک جانتا ہے۔ کوئی فرشتہ یا کوئی انسان نہیں جانتا کہ دلوں میں کیا ہے۔ غرض دل میں جو برائی کے ارادے ہوں اور جن کو آدمی پختہ کرے اور ان کے کرنے کا ارادہ کرے، ان کا بھی اللہ تعالیٰ حساب لے گا۔

یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر شریعت پر عمل اور ایک مسلمان کی زندگی کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ یہ جتنی کمزور ہوں گی' آدمی کی زندگی اتنی ہی کمزور ہوگی، اور جتنی یہ مضبوط ہوں گی آدمی کی زندگی اللہ کی راہ میں اتنی ہی مضبوط اور قوی ہوگی۔

لغزش اور کوتاہی پر مغفرت

جب انسان ایمان اور عمل کی راہ پر چلتا ہے اور اس کو اپناتا ہے تو پھر اس سے غلطیاں بھی سرزد ہوں گی اور گناہ بھی ہوں گے۔ لہٰذا یہ فرمایا گیا کہ غلطیوں اور گناہوں سے نپٹنے والا، عذاب دینے والا اور مغفرت کرنے والا بھی صرف وہی ہے اور کوئی نہیں:

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ لِمَنْ يَّشَآءُ (البقرہ۲: ۲۸۴)
جس کی چاہے گا مغفرت فرمائے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔

جس کو چاہے گا سے یہ نہ سمجھا جائے کہ کوئی اندھیر نگری ہے کہ جہاں کوئی ضابطہ یا کوئی قانون نہیں ہے کہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔نہیں، اس نے اپنے بخشنے اور عذاب دینے کی سنت اور قوانین کو اپنی کتاب میں، اپنے رسول کے ذریعے ہمارے سامنے بیان فرما دیا ہے۔

دُنیا کا رزق جو بے حقیقت ہے، اس کے بارے میں فرمایا:
يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (البقرۃ۲: ۲۱۲)
جس کو چاہتا ہے بغیر حساب کے دیتا ہے۔

اس کی نگاہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اگر وہ کسی کا پورا گھر بھی سونے کا بنا دے تو اس کی نگاہ میں اس کی قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے۔اس لیے دُنیا میں آدمی کو وہ جو چاہے دیتا ہے، البتہ آخرت کی نعمتیں، مغفرت اور عذاب ہمیشہ کی چیزیں ہیں۔ یہی اصل چیزیں ہیں۔اس کے لیے اس نے اپنے قوانین وضوابط بنائے ہیں۔اس کے چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کے کام میں مداخلت نہیں کر سکتا۔کسی انسان یا کسی بھی اور ہستی میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ کسی کو بخشنے سے روک دے یا عذاب دینے سے روک دے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ خیال رہے کہ اللہ کے چاہنے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ بے ضابطہ کام ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہوگا، جیسا وہ چاہے گا ویسا ہی ہوگا، جو چاہے گا وہ اپنی سنت اور اپنے قانون کے مطابق کرے گا، اسی کے مطابق معاملہ کرے گا۔لہٰذا آدمی کا سب سے بڑھ کر رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہونا چاہیے۔اگر اللہ کی نافرمانی ہو جائے، گناہ ہو جائے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس گناہ کو بخشنے پر وہی قادر ہے اور بخشش کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے، اسی کی طرف

لوٹ کر جانا ہوگا۔

رجوع الی اللہ

جب انسان اللہ کی ملکیت کو تسلیم کر لے، اور اس کے محاسبے پر یقین کر لے، تو یہ تیسری چیز ہے جو اس کی تسلی اور سہارے کا سامان ہے۔اس لیے کہ انسان کمزور اور ضعیف ہے، اس سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور گناہ بھی ہوتے ہیں، اگر کوئی ہستی معاف کرنے والی اور گناہوں کو بخشنے والی ہے تو وہ اللہ کی ذات ہے، اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

انسان کو آزادی دی گئی ہے، ارادے کا اختیار دیا گیا ہے، اور اللہ نے اپنی ملکیت اس کے سپرد کر دی ہے، جب کہ خود پردے میں چھپ گیا ہے، تو آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز میری ہے، جس طرح چاہوں اس کو استعمال کروں؛ اسی میں آدمی لغزش کھاتا، پھسلتا اور گناہ کرتا ہے۔ ایسے میں یہ سمجھنا کہ صرف اللہ ہی بخش سکتا ہے اور کہیں سے کوئی مدد نہیں مل سکتی اور نہ کوئی بخش سکتا ہے، وَ مَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰہ (آل عمران ۳:۱۳۵) ’’اللہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے کہ جو گناہوں کو بخش دے‘‘، اسی کو اپنا مرجع و ماویٰ سمجھنا، اس کی طرف لوٹنا، اور اس کو ہر چیز پر قادر سمجھنا، یہ شریعت کی بنیاد ہے۔ یہ آیات جہاں شریعت کی بنیاد ہیں وہاں اگلی دو آیات کے درمیان رابطے اور پل کا کام بھی دیتی ہیں:

ایمان باللہ اور یقین کامل

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِہٖ ۟ (البقرۃ ۲:۲۸۵)

رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے۔ اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم

کرلیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ''ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے''۔

اس آیت میں سب سے پہلے ایمان کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ایمان لاؤ، حکم نہیں دیا گیا بلکہ بیانیہ انداز میں فرمایا کہ اصل بنیاد ایمان ہے۔

ایمان کا لفظ امن سے نکلا ہے، اور امن کے معنی بھروسے کے بھی ہیں اور تحفظ کے بھی، اعتماد کے بھی ہیں اور سلامتی کے بھی۔ دراصل ان سب سے مل کر ایمان کا تصور بنتا ہے۔ جس نے اللہ پر بھروسا کیا، اسی کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لیا، اسی کی حفاظت میں آ گیا' اسی کے دیے ہوئے قوانین کو تسلیم کرلیا اور اس کے ساتھ ایمان کا معاہدہ کرلیا تو یہ وہ چیز ہے کہ رسول بھی اس میں ایمان لانے والوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ یہ ایمان کس چیز پر لایا جاتا ہے؟ اس پر جو ان کے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے، اس پر اللہ کے رسول بھی اور اہل ایمان بھی ایمان لاتے ہیں۔

خود عمل کرنے کے لیے اور دوسروں کو عمل کی دعوت دینے کے لیے، خود کسی چیز کی پیروی کرنے کے لیے اور دوسروں کے سامنے حق کی گواہی دینے کے لیے، خود برائی سے بچنے اور دوسروں کو بھلائی کا حکم دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی کا اس بات پر کامل یقین ہو کہ یہ کتاب جو میرے ہاتھ میں ہے، اس کی تعلیمات میں سے کوئی بھی کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے، بلکہ یہ سب اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ اس کے بعد ہی اس میں جو احکام دیے گئے ہیں ان پر یقین ہوگا، اس میں جو وعدے کیے گئے ہیں ان پر یقین ہوگا، آخرت میں اعمال پر جس بشارت کا اور عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے اس پر یقین ہوگا، اور دُنیا کے اندر بھی جو فتح اور کامیابی کے وعدے فرمائے گئے ہیں ان پر یقین ہوگا۔ اس یقین کے بغیر آدمی ایمان اور عمل کی راہ پر نہیں چل سکتا۔ یہ ایمان اللہ کے رسول کے لیے بھی ناگزیر تھا اور سارے مومن بھی اس ایمان میں شریک ہیں۔

یہاں اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَبِّہٖ سے مراد قرآن مجید ہے۔ دراصل قرآن مجید دین کی ساری تعلیمات اور شریعت کے سارے احکام کا جامع ہے۔ اس لیے قرآن پر ایمان لانے کا مطلب ہر چیز پر ایمان ہے۔ اس پر ایمان لانے کی دعوت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعے اور اپنے رسول کے واسطے سے انسانوں کو دی ہے۔ چنانچہ اس کی تھوڑی سی تفصیل مزید بیان کی گئی ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ و رُسُلِهٖ (البقرة ۲: ۲۸۵)

یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔

یہاں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے، جو اللہ نے اپنے بندے پر اتاری ہے، وہ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان ہے۔ آخرت پر ایمان بھی اس میں شامل ہے لیکن آخرت کا ذکر آگے چل کر بھی آتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں اپنے احکام کا آغاز بھی اسی حوالے سے کیا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ ۲: ۱۷۷)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے۔

یہ آیت، آیت بر کہلاتی ہے۔ اس بنیادی آیت کے بعد ہی قصاص، وصیّت، رمضان، اور جہاد اور دیگر احکام آئے ہیں۔

گویا ظاہری طور پر مشرق و مغرب کی طرف رخ کر لینا کوئی نیکی اور تقویٰ کا کام نہیں ہے بلکہ اصل نیکی اور تقویٰ تو ایمان ہے۔ آگے چل کر ایمان کی بہت سی صفات بیان ہوئی ہیں، یعنی اللہ پر ایمان، کتابوں پر، رسولوں پر، نبیوں پر اور فرشتوں پر ایمان۔ لہٰذا ایمان سب سے

پہلی چیز ہے اور یہ ایمان صرف عقیدے کا زبان سے اظہار نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہمارے علما نے متعین کیا ہے کہ زبان سے اظہار، دل سے تصدیق اور عمل سے بھی اس کی تصدیق ہونی چاہیے۔ یہ ساری چیزیں مل کر ایمان کو ایسا مکمل ایمان بناتی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول ہوگا۔ ہاں، زبانی ایمان، یعنی زبان سے اقرار، اُمت میں شامل رہنے کے لیے، قانونی مقصد کے لیے، اُمت میں جگہ متعین کرنے کے لیے تو کافی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں دل کی تصدیق بھی ضروری ہے اور اعمال سے تصدیق بھی ضروری ہے اور اعمال وجوارح سے اس پر عمل بھی ناگزیر ہے۔

یہاں ایمان کی دعوت دی گئی ہے، اس میں اللہ پر ایمان کے ساتھ فرشتوں پر ایمان بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے حکم کی تدبیر کرنے والے بھی فرشتے ہیں۔ اس کی تدبیر کو نافذ کرنے والے بھی فرشتے ہیں اور یہ ہدایت جو انسان کو ملی ہے، اتاری گئی ہے، اس کو لانے والے بھی فرشتے ہیں، اور پھر کتابیں تو ہیں ہی اس کی اور اس کے رسول اس کے پیغام کو پہنچاتے ہیں۔

دین کی ابدی دعوت

لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ (البقرہ ۲: ۲۸۵)

ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔

یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم سب کتابوں اور سب رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے، یعنی کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننے کے بجائے ہم سب کو خدا کا رسول تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بھی دین کی ایک بڑی اہم بنیاد ہے۔ یہ اس لحاظ سے اہم بنیاد ہے کہ قرآن مجید کوئی ایسی کتاب نہیں ہے کہ جو اچانک نازل ہوگئی ہو اور حکم دیا جا رہا ہو کہ یہ کرو وہ نہ کرو، بلکہ یہ تو انسان کی ابدی اور ازلی ضرورت ہے کہ اس کو بتایا جائے کہ ہدایت کیا ہے؟ صحیح راستہ کیا ہے اور زندگی

کیسے بہتر کی جائے؟ یہ وہ کام ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے پہلے دن سے حضرت آدم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى (البقرہ ۲: ۳۸)، یعنی تمھارے پاس میری طرف سے ہدایت ضرور آتی رہے گی، اور وہ ہدایت آتی بھی رہی۔ اب اگر ہم ان میں سے کسی کا انکار کریں اور کسی کا اقرار، تو خدائی ہدایت کا وہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، جیسے کسی زنجیر کی کسی ایک کڑی کو تسلیم نہ کیا جائے تو پوری زنجیر ٹوٹ جاتی ہے۔ اسی طرح انبیا کرام علیہم السلام کے انکار کا معاملہ بھی ہے۔ دراصل کسی ایک نبی کا انکار اس لیے نہیں کہ ایک نبی کے انکار سے کوئی بڑا فرق پڑ جاتا ہے بلکہ اس سے دعوت و ہدایت کا ایک سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا محتاج ہے اور یہ ہدایت وہ برابر دیتا رہا ہے اور یہ ہدایت انبیا اور رسولوں کے ذریعے انسان کے پاس آتی رہی ہے۔ اس لیے ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے ہیں۔

اس سے دعوت کے کام میں وسعتِ قلب اور کشادہ نظری بھی پیدا ہوتی ہے کہ جو لوگ بھی گمراہ ہیں، یہ بنیادی طور پر گمراہ نہیں۔ ان سب کے پاس جو دین ہے وہ عیسائیت ہو یا یہودیت یا جو بھی دین ہو، اصل میں تو یہ بنیادی طور پر اللہ کی طرف سے دیا ہوا تھا۔ اسی میں خرابی پیدا ہوئی، تحریف ہوئی، لوگوں نے اپنی خواہشات اور دیگر وجوہات کی بنا پر اسے بدل کر رکھ دیا وہ الگ بات ہے، لیکن اس سے كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ (اٰل عمرٰن ۳: ۶۴) یعنی مختلف ادیان میں جو بات مشترک ہے وہ نکالی جاسکتی ہے۔ اس طرح دعوت دین اور شہادت حق کے لیے بڑی اہم بنیاد فراہم ہو جاتی ہے۔

سمع و طاعت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو شریعت کی راہ پر خود چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لیے، اللہ کی اطاعت خود کرنے اور دوسروں کو اس راہ پر لانے کے لیے جو تعلیمات دی ہیں اور جو نسخہ

عطا کیا ہے وہ اس نے ایک دُعا کی صورت میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی اہم اور بنیادی تعلیمات کے لیے بھی قرآن مجید میں بہت سی جگہوں پر یہی انداز اپنایا ہے۔ سورۂ فاتحہ بھی ایک دُعا ہے اور سورۂ آل عمران میں بھی جگہ جگہ دُعائیں آئی ہیں۔

دراصل دُعا کا پیرایہ اس قدر موثر ہے کہ ایک تو آدمی کو بہ آسانی یاد ہو جاتی ہے، پھر وہ اس کو یاد رکھتا ہے اور مانگتا رہتا ہے۔ دوسرے دُعا اس بات کا اظہار ہے کہ جو چیز دُعا کی صورت میں مانگی جارہی ہے، اس کی آدمی کو پیاس ہے، اور وہ اس کے دل کی پکار ہے۔ یہ ایسی تعلیمات نہیں ہوسکتیں جو اوپر سے مسلط کر دی گئی ہوں بلکہ یہ تو بندے کے دل کی پکار کا صِلہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی پانی مانگتا ہے تو دل کے اندر اس کی پیاس ہوتی ہے، کھانا مانگتا ہے تو اسے بھوک ہوتی ہے۔ اسی طرح دُعا کے لیے بھی مانگ اور طلب ہوتی ہے یا دُعا مانگ کر طلب پیدا کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کلمات آسانی سے زبان پر چڑھ جاتے ہیں، اور دل میں راسخ بھی ہو جاتے ہیں، لہٰذا دُعا کا پیرایہ بھی دراصل تعلیم کا پیرایہ ہے۔ یہ تعلیم دینے، اسے زبان پر چڑھانے، دل کے اندر بٹھانے اور راسخ کرنے کا ایک انداز ہے۔ اس کو اپنی پیاس اور اپنی پکار اور اپنی طلب بنانے کا دُعا کے پیرایے میں ایک موثر انداز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تربیت کے لیے اپنایا ہے۔

وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (البقرہ۲ : ۲۸۵)

ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔

یہاں **سماعت** کے معنی کان سے سننے کے نہیں ہیں یا کتاب میں پڑھ لینے کے نہیں ہے بلکہ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ آدمی کھلے دل سے قبول کرے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس پہلو کا ذکر یوں کیا ہے:

قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (الانفال۸ : ۲۱)

انھوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔

گویا کانوں سے تو سنتے ہیں لیکن بات دل میں نہیں اترتی، نہ اس کو قبول کرتے ہیں اور نہ تسلیم ہی کرتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ اس بات کو اس طرح واضح کیا:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا (آل عمران ۳:۱۹۳)

مالک، ہم نے پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کی مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔

گویا جو کچھ سنا اور جو کچھ قبول کیا اس کے اوپر عمل بھی کیا۔

دُعا اللہ تعالیٰ کے ساتھ، شریعت کے ساتھ اور دین کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا بھی اظہار ہے اور ایک معاہدہ بھی۔ چنانچہ قرآن مجید نے سورہ مائدہ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ اپنے اس میثاق اور عہد کو یاد رکھو جب تم نے کہا: **اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدہ۵:۷)**، یعنی تمھارا یہ قول کہ ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔ اس طرح گویا دونوں چیزوں، یعنی اپنے عزم کا بھی اظہار ہو گیا اور اپنے معاہدے کا بھی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میثاق اور معاہدہ بھی تازہ ہو گیا۔ سمع وطاعت کا تقاضا سورۂ بقرہ اور پورے قرآن مجید میں جو کچھ رب کی طرف سے اتارا گیا ہے، جو بھی ہدایت بھیجی گئی ہے، اور شریعت کے جو بھی احکامات ہیں، ان سب کو ماننا، قبول کرنا، اور ان پر عمل کرنا ہے۔

مغفرت اور رحمت کی طلب

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا (۲:۲۸۵)

تیری بخشش اے ہمارے رب!

یہاں کوئی فعل نہیں استعمال ہوا ہے، جیسے ہم کو بخش دیجیے، یا یہ کہ اپنی بخشش ہمیں عطا کیجیے۔ عربی زبان کا یہ معروف پیرایۂ بیان ہے۔ جس میں فعل حذف ہو جاتا ہے اور جو چیز مطلوب ہو صرف اس کا ذکر رہ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں

دراصل بڑا زور، بڑا اضطراب ، بڑی بے چینی اور طلب پائی جاتی ہے، جیسے کوئی پیاسا ہو اور مارے پیاس کے اس کا بُرا حال ہو۔ اور کہہ رہا ہو: پانی ، پانی ، پانی لاؤ، مجھے پانی چاہیے۔ اس کے پاس لمبے لمبے اور پُر تکلف جملے بولنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ اس کا اضطراب اس کو اس بات کی مہلت ہی نہیں دیتا بلکہ وہ بے قرار ہو کر پانی پانی پکار اٹھتا ہے۔ یہ دراصل اس کے اضطراب، طلب اور طلب کی شدت کا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں سمع و طاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت بھی مانگی گئی ہے۔اس لیے کہ **سمعنا و اطعنا** بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔اللہ کے سارے احکام کو ماننا، قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا یہ کوئی آسان بات نہیں بلکہ بڑی بھاری ذمہ داری ہے، اور اگر اللہ کی مغفرت، رحمت ساتھ نہ ہو تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں ایک اور مقام پر یوں بیان فرمائی ہے کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ان کو آزمایش میں ڈالا اور حکم دیا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ پھر شیطان نے ان کو پھسلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کو استغفار کی تعلیم دی، مغفرت کے لیے دُعا سکھائی اور اسی دُعا کے ذریعے انھوں نے استغفار کیا اور اللہ نے ان کو معاف کر دیا۔

انسان کی فطری کمزوری، یعنی اختیار اور ارادے کی وجہ سے گناہ کا شکار ہوسکتا ہے اور ہوگا، اس میں اس کی تسلی اور سہارے کا سامان یہ ہے کہ اگر وہ گناہ کرے گا اور اللہ کی طرف پلٹے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرمادے گا۔اسی لیے یہاں پر یہ نہیں کہا کہ معافی مانگو، بلکہ زبان سے اس کا اظہار ایک ایسے انداز میں کروایا ہے کہ جو پیاس، پکار اور طلب کو ظاہر کرتا ہے: غُفْرَانَكَ رَبَّنَا' اور تیری مغفرت اے میرے رب۔

وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۲:۲۸۵)

اور تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

یہ گویا اپنے آپ کو تمام اعمال کا حساب دینے کے لیے بالکل اللہ کے سپرد کر دینا ہے۔ ابتدا میں جہاں پر ایمان کا ذکر آیا تھا وہاں آخرت کا ذکر نہیں تھا۔ اب یہاں آخرت پر ایمان کا بھی ذکر آیا ہے کہ ہر چیز کو تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اس بات کا پہلے ہی ذکر آ چکا ہے کہ جب تیرے پاس آئیں گے تو بخشنے والا صرف تو ہے، اور تیرے اس اختیار میں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں ہے۔ اگر تیرے قانون کے تحت میں شفاعت، بخشش، مغفرت، اور جنت کا مستحق نہیں ٹھیرتا تو کوئی دوسرا مجھے وہ نہیں دلا سکتا، اور اگر تیرے قانون اور سنت کے تحت میں عذاب کا مستحق بنتا ہوں تو کوئی دوسرا مجھے اس سے نہیں بچا سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے دُعا سے قبل ایک دو باتوں کی طرف مزید توجہ دلائی ہے۔

ہمت و استطاعت

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط

(البقرۃ ۲:۲۸۵)

اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔

انسان کی ہمت و استطاعت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ ہر ایک کے لیے وہی کچھ ہے جو وہ کمائے۔ لفظی ترجمہ یوں ہوگا: اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا، اور اس کے اوپر وہ ہے جو اس نے کمایا، یعنی جو اس نے نیکی کی اس کا اجر اس کے لیے ہے اور جو برائی کی اس کا عذاب اس کے سر پر ہے۔ یہاں 'لِ' اور 'عـلـی' استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں ایک کے اندر اجر کا اور دوسرے کے اندر عذاب کا ذکر ہے۔ خیال رہے کہ سمع و طاعت کا عہد کرنے کے بعد دل دہلا دینے والے، قدموں میں لرزش پیدا کرنے والے، اور یہ کہ چوں گویم مسلمانم بلرزم

(جب کہتا ہوں: مسلمان ہوں، تو میں لرز جاتا ہوں) جیسے مطالبات کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہر ایک کو اپنے کیے کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے اندر جہاں آسانی ہے وہاں سخت پکڑ بھی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا دل کے وسوسوں کے بارے میں بھی پوچھ گچھ ہوگی؟ خاص طور پر جب یہ فرمایا گیا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (اٰل عمران ۱۰۲:۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین لرز کر رہ گئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کر سکیں۔ جب قرآن مجید نے وضاحت کی کہ: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۱۶:۶۴)، یعنی جتنی تمھاری استطاعت ہے اسی قدر تقویٰ کا مطالبہ ہے تو انھیں کچھ اطمینان ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بیعت لیتے تھے تو بعض دفعہ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے الفاظ میں استطاعت کی شرط بڑھوا دیتے تھے، یعنی حسب استطاعت۔ اسی طرح جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو میں نے حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا: ما استطعتم، یعنی جہاں تک تمھاری استطاعت وقوت ہو، اتنا ہی مطالبہ ہے اس سے زیادہ نہیں۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ انسان اس چیز کے لیے جواب دہ نہیں ہوسکتا ہے جو اس کے ارادے اور اختیار سے باہر ہو۔ یہ اللہ کے عدل کے بھی خلاف ہے اور رحمت کے بھی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے جس چیز کا بھی مطالبہ کیا ہے وہ اس کے بس میں ہے۔ گویا ایک طرف اس میں سہولت، آسانی اور بشارت ہے، تو دوسری طرف بھاری ذمہ داری بھی ہے۔ اب اگر وہ ہم سے کسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے، جیسے پانچ وقت کی نماز، زکوٰۃ، حج اور جہاد کا، یا غیبت، جھوٹ اور بہت سی چیزوں سے پرہیز کا، تو یہ ہمارے بس سے باہر نہیں ہیں، اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ اگر یہ ہمارے بس سے باہر ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہم سے مطالبہ ہی نہیں کرتا

بلکہ اس نے شریعت کے تحت جو فرائض عائد کیے ہیں، ان کی ادا ئیگی مسلمان پر فرض ہے، الا یہ کہ آدمی پاگل ہو جائے، مجنوں ہو جائے، بیہوش ہو جائے یا کسی عارضے کا شکار ہو جائے۔ فرائض سے کوئی معافی نہیں ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نماز پڑھنے کی بہت کوشش کرتا ہوں مگر پڑھی نہیں جاتی۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ اس لیے کہ شریعت کا جو بھی مطالبہ ہے خواہ سود کا حرام ہونا ہو، یا زکوٰۃ کے احکام ہوں یا جہاد، یا کوئی بھی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو آدمی کی استطاعت سے باہر ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہم سے اس کا مطالبہ ہی نہ کرتا۔

اعمال کی جواب دہی

لَهَا مَاكَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَااكْتَسَبَتْ (البقرۃ ۲ : ۲۸۵)

ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔

گویا انسان جو کچھ بھی کرے گا اس کا اجر وثواب یا عذاب اسی کے اوپر ہوگا۔ کوئی دوسرا اس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا یا کوئی دوسرا اس کی کوشش کے ثمرات میں سے اپنا حصّہ زبردستی وصول نہیں کر سکتا۔ یہ آیت بھی ایک بڑی بشارت پر مبنی ہے اور دوسری طرف بڑی سخت آیت بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو بھی نیکی ہوگی وہ میرے کرنے سے ہوگی، اور میں جس برائی کا مرتکب ہوں گا اس کا الزام بھی میں کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکتا، نیز اپنے اعمال کا بوجھ خود ہی اٹھانا ہوگا۔

سورۂ فاطر کی جب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ط (فاطر ۳۵:۱۸)، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا تو بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کہا کہ قرآن مجید کی سب سے مشکل اور سخت آیت یہی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ اس کے بعد اب کوئی عذر تراشنے کا جواز باقی نہیں رہا کہ یہ

ہمارے بس میں نہیں تھا۔ ہم اپنے اعمال کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں نے گمراہ کر دیا، یا بڑے بڑے لوگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا کیا قصور، ان کے تو مشیر ایسے تھے جنھوں نے ایسے مشورے دیے۔ یہ سب عذر بلا جواز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی کسی فرد کی ذمہ داری دوسروں پر نہیں ڈالی۔ ہر شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔

قرآن مجید میں کئی جگہ یہ منظر بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ گمراہی کے سرغنوں کے متبعین کہیں گے کہ ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ یہ دن رات ہم سے کہتے رہتے تھے کہ یہ کرو۔ آپ ان کو عذاب دیں، ہمیں نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہر ایک کے لیے عذاب ہے، دونوں ہی ذمہ دار ہیں اور دونوں ہی کو عذاب ملے گا۔ اور کوئی آدمی کسی دوسرے کو اپنے گناہوں کا ذمہ دار ٹھیرا کر اپنے آپ کو بری نہیں کر سکتا، اِلَّا یہ کہ اس کو جبراً مجبُور کر دیا گیا ہو۔ کسی عورت سے اگر جبراً زنا کیا گیا ہو تو وہ مجبُور ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح اگر کسی پر جبر و تشدد ہوا ہو تو وہ معذور اور مستثنیٰ ہے۔ اس کے علاوہ کسی کا مشورہ قبول کر لیا، کسی کے بہکاوے میں آ گئے اور کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو اس کا کوئی الزام کسی دوسرے کو نہیں دیا جا سکتا، حتیٰ کہ شیطان کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ اس لحاظ سے یہ آیت ایک طرف تو آسانی اور سہولت پیدا کرنے والی آیت ہے کہ انسان پر اس کی ہمت و استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور جبر پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اور دوسری طرف ہر شخص کو اس کے اعمال کا ذمہ دار بھی ٹھیرایا گیا ہے۔

احساسِ ذمہ داری

اس کے بعد پھر دُعا کا سلسلہ شروع ہوتا ہے:

رَبَّنَالَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (البقرہ ۲: ۲۸۶)

اے ہمارے رب، ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کر۔

استغفار کی یہ دُعا اسی تسلسل میں ہے کہ جو تیری راہ میں چلیں گے ان سے خطائیں بھی سرزد ہوں گی، اس لیے کہ بھول چوک تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو تشخیص کی کہ ان سے کیسے خطا ہوگئی، کیسے نافرمانی ہوئی اور کیوں کر گناہ ہوا، تو اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھول ہوگئی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے غفلت کا علاج سب سے بڑھ کر کیا ہے۔ غفلت کا علاج ذکر ہے۔ ذکر کے معنی ہیں اللہ کی یاد اور غفلت سے دوری۔ اسی لیے تاکید کی گئی ہے کہ صبح شام ذکر کرو، اُٹھتے بیٹھتے اللہ کو یاد کرو، چلتے پھرتے یاد کرو، رات دن یاد کرو، اور کثرت سے یاد کرو۔ پانچ وقت کی نماز کا نسخہ بھی اسی لیے دیا گیا ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ o (طٰہٰ ۲۰:۱۴) 'میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔ اس طرح بھول کا چوک کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

آدمی سے بھول چوک ہو جائے تو اس کے لیے نَسِیَ کا لفظ آتا ہے۔ یہی لفظ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ گویا یہاں دُعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی جا رہی ہے کہ جس طرح آدم علیہ السلام سے خطا ہوئی تھی، اسی طرح اگر ہم سے بھی غلطی ہو جائے تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیے، اور اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہمیں معاف فرما دیجیے۔ مفسرین کے مطابق خدا کے قانون کے تحت اگر آدمی بھول کر کوئی کام کرے، یا غلطی سے کوئی خطا ہو جائے تو وہ معاف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ معافی کیوں مانگی گئی ہے۔

مجموعی طور پر معافی تو غُفْرَانَكَ رَبَّنَا میں پہلے ہی آ گئی ہے جس کی تفصیل احادیث میں اس طرح آئی ہے کہ جو گناہ ہم نے دانستہ کیے یا انجانے میں، رات میں کیے یا دن میں، کھلے کیے یا چھپے، گویا ہر قسم کے گناہوں کی معافی اس میں آ جاتی ہے۔ دراصل یہاں جس شدتِ احساس کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر معمولی سی غلطی یا بھول چوک ہو جائے' تو اس کے لیے بھی آدمی کا دل کتنا حساس ہونا چاہیے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے سفید کپڑوں پر راہ چلتے کوئی

چھینٹ پڑ جائے یا اتفاق سے دھبہ لگ جائے تو وہ بے چین ہو جائے کہ یہ کیوں ہو گیا اور اس کو صاف کرنے کے لیے وہ بے چین ہو جائے۔ اس قسم کا ضمیر اور دل مطلوب ہے تا کہ آدمی خرابیوں اور برائیوں سے بچ سکے۔

آسان زندگی

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ (۲:۲۸۶)

مالک، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے، پروردگار، جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ۔

اس دُعا کے پہلے حصّے میں اصرًا کا لفظ آیا ہے، جب کہ دوسرے حصّے میں بوجھ کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اصـرًا کے معنی ذمہ داری کے ہوتے ہیں، اور یہاں دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کے مطالبات میں سے کوئی ایسا مطالبہ، یا احکام میں سے کوئی ایسا حکم ہم پر عاید نہ کرے کہ جس ہم نہ اٹھا سکیں۔ پہلے لوگوں سے مراد دراصل بنی اسرائیل ہیں۔ اصــرا سے مراد شریعت کے اندر وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے لازم نہیں کیں لیکن اُمت نے خود سے اپنے اوپر لازم کر کے اپنا بوجھ بڑھا لیا، جیسا کہ بنی اسرائیل نے کیا۔ اللہ نے اپنے نبی امی ﷺ کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ طیّبات کو حلال کرتا ہے اور خبائث کو حرام کرتا ہے۔ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ (الاعراف ۷:۱۵۷)، اور جو بوجھ اور بیڑیاں ہیں ان کو ہٹاتا اور دور کرتا ہے۔ چنانچہ اصــــرًا سے مراد وہ چیزیں ہیں جو شریعت کے احکام سے ہٹی ہوئی اور اضافی ہوں۔

شریعت میں یہ اضافے کئی طرح سے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ سوال کر کے اور بال کی

کھال اتار کر اپنا بوجھ بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی مثال سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے ضمن میں دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ گائے ذبح کرو۔ وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی۔ مگر کم و بیش ۲۰ مختلف سوالات کر کے کہ وہ گائے کیسی ہو، اس کا رنگ کیا ہو، کس قسم کی ہو وغیرہ وغیرہ، انھوں نے اپنے لیے ایک ایسی گائے مقرر کرالی جس کی تلاش بھی بڑی مشکل تھی، اور جو پرستش کے لیے مخصوص تھی، اور جسے وہ قربان نہ کرنا چاہتے تھے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم پر حج فرض ہے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا ہر سال فرض ہے؟ آپ ﷺ خاموش رہے۔ انھوں نے دوبارہ یہی سوال کیا تو آپ ﷺ کے چہرے پر ناراضی کے آثار ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ اگر میں کہہ دیتا ہر سال، تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ تم ہر سال حج نہیں کر سکتے، یہ تم اپنے اوپر بوجھ ڈال رہے تھے۔ پھر فرمایا: دیکھو جن چیزوں کا میں ذکر نہ کروں، چھوڑ دوں تو تم بھی چھوڑ دو اور سوال مت کرو، اور جو حکم دوں، جتنی استطاعت ہو اس پر عمل کرو۔ نبی کریم ﷺ کی یہ واضح ہدایت ہے۔ آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے: **الدین یسر** دین آسان ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ انسان کو کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جو اس کے بس سے باہر ہو۔

دین میں دوسرا بوجھ یہ ہے کہ علما اور فقہا کی تعبیروں کو بھی احکام الٰہی کی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ بھی وہ چیز ہے جو زندگی کو بوجھل بنا دیتی ہے۔ یہودیوں کی اسی روش کا نتیجہ تھا کہ ان کے لیے زندگی بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔

سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے ایک خطبے میں، علما سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے اس دین کو اتنا بوجھل بنا دیا ہے کہ عام آدمی کے لیے اس کو اٹھانا مشکل ہو گیا ہے، اور تم ان کی مدد کرنے کے لیے انگلی بھی نہیں اٹھاتے کہ وہ دین کا بوجھ اٹھا سکیں۔

نبی کریم ﷺ نے دین کا بوجھ ہر آدمی کی وسعت و استطاعت کے مطابق رکھا۔ اس دُعا کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ شریعت کے احکام اور دین کے مطالبات میں جس طرح پہلے لوگ گمراہ ہوگئے اور انھوں نے ان سے دین کو اپنے لیے بوجھ بنا لیا، اے اللہ اس طرح ہم کو گمراہ نہ کرنا۔ اس دُعا کے دوسرے حصّے میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ہمارے اندر برداشت کی طاقت نہیں، یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی راہ میں چلتے ہوئے آنے والی آزمایشوں کا ذکر ہے کہ اے ہمارے رب، ہمیں ایسی آزمایش میں نہ ڈالنا جس کو اٹھانے کی ہمارے اندر طاقت نہ ہو۔

یہ بات مسلّمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسی آزمایش نہیں ڈالے گا یا نہیں ڈالتا جو آدمی کی طاقت سے باہر ہو، اور اگر ایسا ہوا اور وہ اس میں ناکام ہو جائے تو پھر وہ اس پر جواب دہ نہیں۔ یہ پیرایۂ بیان دراصل ایک ایسے بندے اور غلام کا ہے جو اس خدشے سے لرز رہا ہے کہ جب میں دین کی راہ پر چلوں گا تو آزمایشیں آئیں گی اور خدا کے امتحان میں پورا اترنا کسی بندے کے بس میں نہیں ہے، لہٰذا وہ درخواست گزار ہے کہ اگر آزمایشیں آئیں بھی تو ہلکی ہوں جن کو ہم آسانی سے اٹھا سکیں اور ایسی آزمایشیں نہ ہوں جو مشکل ہوں۔ انسان اپنے پروردگار سے آسان راستے کی طرف راہنمائی کی استدعا کر رہا ہے۔

خدا کی مدد اور نصرت

اس کے بعد مغفرت کی دُعا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات او پر بھروسے اور مدد اور نصرت کی درخواست ہے۔ دین اور شریعت کی راہ جو کہ کفار سے مجاہدے اور جہاد کی راہ ہے، اس کا ذکر چند الفاظ میں فرما دیا گیا ہے:

وَاعۡفُ عَنَّاوقفة وَاغۡفِرۡ لَنَاوقفة وَ ارۡحَمۡنَاوقفة (۲: ۲۸۶)

ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر۔

تین چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک عفو، یعنی معافی دوسری مغفرت، اور تیسری: رحمت۔ مغفرت کے اصل معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ لینا۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو آدمی گناہ کرتا ہے، اس کے نتائج دُنیا میں بھی ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی، دل پہ بھی ہوتے ہیں اور روح پر بھی۔ اسی طرح ہر گناہ سے دل پر بھی زنگ لگ جاتا ہے اور روح پر بھی۔ اگر گناہ معاف ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کا عذاب نہیں دے گا، اور اس کے جو اثرات روح، قلب، زندگی اور آخرت میں ہوتے ہیں، وہ دور ہو جاتے ہیں۔ یہاں دراصل اسی مغفرت کی طرف اشارہ ہے جو گناہوں کو معاف کر دے، اور ان کو دھو دے، اور ان کے مواخذے سے بچالے، اور اللہ ان سے چشم پوشی کر لے۔ ان کے جو اثرات ہیں ان کو بھی ڈھانپ لے اور ان سے بھی محفوظ فرمالے۔

رحمت کا لفظ بڑا وسیع ہے۔ اس میں اللہ کی طرف سے ہر انعام، اجر اور بخشش، دُنیا میں سہولت اور آسانی، فتح اور نصرت، اور آخرت میں انعامات اور جزا، ہر چیز شامل ہے۔ رحمت کا تصور اس قدر وسیع ہے کہ یہ ہر چیز پر غالب ہو جاتا ہے۔ رحمت کے مفہوم میں مغفرت بھی شامل ہے اور عفو و درگزر بھی۔

اس کے بعد نصرت کا ذکر آتا ہے۔ یہ بھی رحمت میں شامل ہے۔ پھر فرمایا:

اَنۡتَ مَوۡلٰنَا (۲:۲۸۶)

تو ہمارا مولیٰ ہے۔

مولا وہ ہے جو کام بنانے والا ہو، جس سے اپنے مسائل کے حل کے لیے رجوع کیا جائے، جس کا سہارا لیا جائے، جو پشت پناہ اور رکھوالا ہو، جو ہاتھ پکڑ لے اور راستے پر چلائے۔ اسی پہلو کی آگے چل کر تفسیر نِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلِ ہے، یعنی سب آقاؤں میں بہترین، سب کام بنانے والوں میں سب سے اچھی تیری ذاتِ اقدس ہے۔ یہاں پر صرف اتنی بات کہی گئی ہے کہ تو ہمارا مولا، ہمارا آقا اور ہمارا کارساز ہے۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَo(البقرۃ ۲: ۲۸۶)

کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

یہاں یہ دُعا کی جارہی ہے کہ اے اللہ اس راہ میں جو انکار کرنے والے ہیں، مخالف ہیں، ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرمائیے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد کئی طریقے سے ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے اندر کی پختگی، یہ بھی اللہ کی مدد سے ہوتی ہے۔ استقامت اور عزم و حوصلہ بھی اللہ کی مدد ہے۔ تھوڑے ساز و سامان میں برکت دینا اور بڑے ساز و سامان پر حاوی ہونا، اور دشمن کے دل میں رعب اور ہیبت بٹھانا کہ ایک ایک آدمی دس دس دکھائی دیں، یہ بھی اللہ کی مدد ہے۔ دشمن کو نظروں میں حقیر کر دینا کہ وہ اگر دو ہوں تو ایک دکھائی دیں، ان کے وافر اسلحے کے مقابلے میں اپنے کم اسلحے کو کافی سمجھنا، تو یہ بھی اللہ کی طرف سے مدد ہے۔ یہ اس کی مدد کے غیبی طریقے ہیں اور وہ فرشتوں کے ذریعے بھی مدد کرتا ہے۔ ساز و سامان دینا یہ بھی اس کی طرف سے مدد ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی نصرت کے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو آپ ﷺ کے مشن کی تکمیل پر فتح کی بشارت دی تو فرمایا:

اِذَاجَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُo (النصر ۱۱۰:۱)

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے۔

یہاں پہلے نصرت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد فتح کا ذکر آتا ہے۔ فتح کا دروازہ نصرت کے بغیر نہیں کھل سکتا، اور اگر کوئی اللہ کو ناراض کر کے چاہے کہ وہ فتح و کامیابی حاصل کر لے گا، یہ ممکن نہیں ہے۔ اللہ کی راہ پر چل کر اور اس کی اطاعت کر کے ہی کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔

جہاد اور قتال

اس آخری آیت میں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ شریعت کا محض اتنا ہی مطالبہ نہیں ہے کہ آدمی خدا کی اطاعت اور بندگی میں لگا رہے، بلکہ ایمان کا تقاضا قتال اور جہاد بھی ہے، اور راہ خدا میں اپنی جان قربان کرنا بھی ہے۔ درحقیقت زندگی موت سے وابستہ ہے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں لڑنے مرنے کو تیار ہوں، انھی سے قوم کی زندگی وابستہ ہے۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ جینے کے خواہشمند ہوں، زندگی سے چمٹے رہیں اور زندگی کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہو جائیں، ان سے قومیں زندہ نہیں رہتیں، نہ مسلمان قومیں اور نہ کافر۔ قومیں تو ان لوگوں سے زندگی پاتی ہیں جو اپنے مقصد کی خاطر جینے مرنے کے لیے تیار ہوں۔ قوموں کی زندگی بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو ایمان، جہاد اور قربانی اور اللہ کی راہ میں مرنے مارنے سے زندگی بخشتا ہے۔

یہ اگرچہ ایک چھوٹی سی آیت ہے مگر اس کے اندر ان تمام بنیادی مضامین کی طرف اشارہ ہے جو بعد میں آگے چل کر بیان ہوئے ہیں۔

اس تشریح کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ واقعی یہ عرش کے خزانوں میں سے ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ میں کیا بیان کرسکتا ہوں، اور آپ کیا سمجھ سکتے ہیں، اللہ کے خزانے تو نہ ختم ہونے والے اور لامتناہی خزانے ہیں۔ ان میں سے یہ ایک خزانہ ہے جو اس نے ہمیں عطا کیا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح پرندہ سمندر میں چونچ مارے تو پانی آجائے۔ اس سے زیادہ ہم نہیں پاسکتے، لیکن یہ بھی ہمارے لیے بہت ہے، اور بڑی کثرت کے ساتھ ہے۔

ایمان اور احتساب

ہر شخص کو یہ آیات بار بار پڑھنی چاہییں، اور رات کو سوتے ہوئے تو ضرور پڑھنی چاہییں،

اس لیے بھی اس کی ہدایت حضور ﷺ نے بھی فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی اہمیّت کے پیشِ نظر یہ تاکید بھی فرمائی ہے کہ اسے اپنی عورتوں کو بھی تعلیم دو اور بچوں کو بھی۔ غرض اس کے پڑھنے کی بہت تاکید فرمائی گئی ہے۔

اس آیت کے مضامین کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو اس کا تقاضا ہے کہ اللہ سے تعلّق مضبوط ہو اور ہر حال میں اس کی اطاعت کی جائے (سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا)۔ اگر گناہ ہو جائے تو اس سے مغفرت مانگی جائے اور اسی پر بھروسا کیا جائے۔ دین کو ایسا بوجھ نہ بنایا جائے کہ نہ خود اٹھا سکیں اور نہ دوسرے اٹھا سکیں اور لوگوں پر ایسے مطالبات کا بوجھ نہ ڈالا جائے کہ جن کا اٹھانا ان کے لیے مشکل ہو جائے۔ ان آزمایشوں سے ڈرتے رہنا جو اس راہ میں آتی ہیں، نیز گرنے، پھسلنے اور کمزور پڑنے کا اور اللہ کی راہ سے ہٹ جانے کا خطرہ جو سر پر منڈلاتا رہتا ہے، اس سے خدا کی پناہ اور اس کی راہ میں استقامت طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ سے حق و باطل کی کش مکش اور جہاد میں مدد، نصرت اور غلبہ و فتح کی دُعا کی جائے۔

آخری دو آیات اور اس سے پہلے کی آیت جو پوری سورہ اور ان دو آیات کے درمیان بنیاد، ربط اور پل کا کام کرتی ہے، وہ ہے:

لِلّٰہِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (البقرة ۲: ۲۸۶)

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔

یہ آیت بھی دین کی بنیادی تعلیمات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ ہماری آنکھیں، ہاتھ پاؤں، جسم و جان، وقت، صلاحیتیں اور وسائل، ہر چیز اللہ کی ہے، اور انھیں اپنی ملکیت نہیں سمجھنا چاہیے۔

آخر میں ایمان ذکر کیا گیا ہے۔ ایمان تو اسی بات کا اقرار ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ (التوبة ۹:۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے میں

خرید لیے ہیں۔

گویا جو ایمان لاتا ہے وہ اپنی ہر چیز اللہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اگرچہ سب چیزیں تو اسی کی ہیں لیکن یہ اس کی بندہ پروری اور خصوصی کرم نوازی ہے، کہ وہ انھیں جنت کے بدلے خرید لیتا ہے۔ ایمان لانے کے بعد عبدیت ایک طرح کے معاہدے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی دراصل دین اور شریعت کی بنیاد ہے، شریعت کے مطالبات میں سے ایک اہم مطالبہ اور عظیم الشان ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر شہادت حق کی عائد فرمائی ہے۔

اگر ان آیات کی تلاوت کی جائے اور جیسا کہ بار بار ان کی تلاوت کرنے کی تاکید کی گئی ہے، ان پر غور و فکر اور تدبر کیا جائے اور ان مضامین کو ذہن میں رکھا جائے جو دین کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل ہیں تو ایک مختصر وقت میں ہم عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ پا سکتے ہیں، دین کے تقاضوں کو تازہ کر سکتے ہیں، اور اپنے جائزے اور احتساب سے تزکیہ نفس کا سامان اور تقویت ایمان کا اہتمام کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَo

❖❖❖